ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر محمد کامران شہزاد
لیکچرار شعبۂ اُردو، پنجاب کالج سرگودھا

فلسطینیوں کی مزاحمت؛ اُردو ناول کے تناظر میں

Dr . Muhammad Kamran Shahzad
Lecturer, Punjab College Sargodha.

The Philistine's resistance: in the perspective of Urdu Novel

The land of Palestine is one of the most ancient regions of the world which was occupied by Israeli forces in 1967. Due to Israeli barbarism the Palestine issue effected every sensitive person and the literary society also could not remain uneffected by it. Due to this reason, the Palestine issue was made primary or secondary theme in several genres of literature. Pakistani novelists have also portrayed the resistive trends of Palestinian Muslims against Israeli barbarism in their novels. In this context Mustansar Hussain Tarar's "Rakh", Salma Awan's "Lahu ka Raang Phalestine" and Hassan Manzar's "Haabs" have been included in this articl.

Keywords: *Palestine issue, Israeli barbarism, Urdu Novel, Resistance.*

دنیا کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کریں تو فلسطین کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ سرزمین "فلسطین" کا قبلہ اول بیت المقدس اور انبیا کرام کی سرزمین کے ناطے سے احترام کیا جاتا ہے، جب انسان اپنے کسبِ معاش کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ چل پھر کر زندگی بسر کرتے تھے تو ۲۵۰۰ قبل مسیح کے قریب یہاں آ کر آباد ہوئے بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں جبکہ دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو بیت المقدس میں قیام کرایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے جن کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کئی دیگر انبیا کرام اسی سرزمین پر پیدا ہوئے

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

بیسویں صدی میں ۱۹۴۸ءتک یہ خطہ خلافت عثمانیہ کا حصہ رہا مگر بعد میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا اور یہاں کے بیشتر علاقوں میں اسرائیلی ریاست قائم کر دی گئی۔ فلسطینی عوام کے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۶ء کے درمیانی ماہ و سال صہیونی ریاستی تشدد کے خلاف ناکام مزاحمت میں گزرے[1]۔ بالآخر ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر اسرائیل قابض ہو گیا، جو کہ فلسطین کا دارالحکومت تھا، جس کو اسرائیلی یروشلم کہتے تھے۔ اس وقت سے عہد حاضر تک فلسطین کی عوام جدوجہد آزادی کے لیے سراپا احتجاج ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں لکھے جانے والے ادب میں ایک موضوع فلسطین کی آزادی بھی رہا۔

اُردو ادب میں بھی فلسطینی جدوجہد آزادی کی حمایت میں تخلیق کاروں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ شعرا میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ظفر علی خان، احمد فراز جبکہ فکشن میں انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، مظہر الاسلام، خالد سہیل، جمیل احمد عدیل، مستنصر حسین تارڑ، سلمٰی اعوان اور حسن منظر شامل ہیں۔ ان شعرا اور فکشن نگاروں نے کہیں تو فلسطین کے بنیادی موضوع پر فن پارہ تخلیق کیا تو کہیں یہ موضوع ثانوی ٹھہرا۔ زیرِ نظر مقالے میں مستنصر کا "راکھ" حسن منظر کا " حبس" اور سلمٰی اعوان کا "لہو رنگ فلسطین" میں مزاحمتی رنگ کو جانچا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ناول "راکھ "(۱۹۹۷ء) میں کثیر الموضوعات پر قلم اٹھایا ہے ۔ ناول میں چار اقسام کی مزاحمت بیان کی ہے ان میں مقدس سر زمین فلسطین پر اسرائیلی قبضے کے خلاف مزاحمتی رویہ اپنایا ہے۔ ناول میں فلسطین پر اسرائیلی قبضے میں اسرائیلی کے یہودیوں کی فلسطنیوں سے مہنگے داموں زمین خریدنے اور اس کے بعد خصوصاً غزہ کی پٹی میں مجبور و بے کس فلسطینیوں پر اسرائیل کی طرف سے عرصہ حیات تنگ کرنے کی دل گداز کہانی کو سادہ و عام فہم انداز میں رقم کیا ہے۔

برطانیہ میں مسلم مخالف بات کرنے والے یہودی لڑکوں کی بات پر چند مسلمان نوجوانوں کے جارحانہ عزائم اور رویوں کی بھی ناول نگار نے لفظی عکس بندی کی ہے، جو مصر، اسرائیل جنگ میں اسرائیل کی جیت اور مصریوں کے مالی اور جسمانی نقصان پر دکھ کی کیفیت میں آ کر یہودی لڑکوں کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے:

> "جیک میکڈوگل جو اگرچہ ایک تعصب زدہ سکاٹ تھا اور ہمیشہ ساتھی انگریزوں کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا تھا آج اس کی بھی فریکوئنسی بدلی ہوئی تھی "مین تم نے دیکھا نہیں کہ کتنی آسانی سے پورٹ سعید کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی ہے۔۔۔۔ اور جب ہمارے لیڈر ۔۔۔۔ مائنڈ یو سکاٹش لیڈز پیراشوٹوں سے وہاں اُترے ہیں تو میں تمہیں سچ بتاتا ہوں کہ

یہ۔۔۔ مصری اپنے مورچے چھوڑ کر فرار ہو گئے۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔اپنی لاشوں کی بجائے
انہوں نے اپنے بوٹ پیچھے چھوڑنا زیادہ بہتر جانا۔"[۲]

سلمٰی اعوان کا ناول "لہو رنگ فلسطین"(۲۰۱۳ء) محبت کے ان مٹ اور ان کہے جذبات کا آئینہ ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی شعور کی چاشنی میں گندھے مزاحمتی عناصر سے لبریز ایک سو بیس سالہ فلسطینی ارضی خوں آشام کی تاریخ بھی ہے۔ناول کی کہانی ۱۸۹۹ء سے شروع ہو کر اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں پر محیط ہے، جو چار نسلوں کی کہانی ہے۔ناول کے اہم کرداروں میں یوسف ضیا اور اس کا بیٹا ڈاکٹر موسٰی، ڈاکٹر موسٰی کا بیٹا ڈاکٹر منصور اور اس کی بیٹی ایمان، محمود درویش اس کے علاوہ یہودی کردار یائل اور اس کا بیٹا شامل ہیں یہ تمام کردار اپنے اپنے عہد میں ارضِ فلسطین کے حالات کے حوالے سے امید کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔ سلمٰی نے جہاں مسلمانوں کی یروشلم فتح کرنے کے بعد مذہبی رواداری اور محکوم قوموں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبات کا احوال رقم کیا ہے وہیں ہر مرتبہ یہودیوں اور عیسائیوں کے فتح ہونے کے بعد بلا تخصیص مسلمانوں کے خون کی ہولی سے کھیلنے کی دیرینہ رسم کی لفظی صورت گری بھی دکھی کیفیت سے کی ہے۔ فلسطینیوں نے جہاں محدود وسائل کے باوجود مزاحمت کی، وہاں ہی ان کی اس مزاحمت کا عذاب ہزاروں لاکھوں مظلوم فلسطینیوں کو بے گھری کی صورت میں کاٹنا پڑا۔ مصنفہ نے عرب ممالک کے سربراہوں کی بے غیرتی، بے حسی اور فلسطینیوں پر مظالم کی صورت میں اپنی آنکھیں بند کر دینے کی روش کو کرب انگیز انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ قاری ان کی سحر انگیز نثر کے بیانیے میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ قاری خود کو ارضِ فلسطین کے کوچوں میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔

مصنفہ نے جہاں یہودی ظالموں نے مکروہ چہروں سے پردہ اتارا ہے وہیں "یائل"، ابراہیم، ایلدن اور دیگر ایسے یہودیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جنھوں نے تعصب سے بالاتر ہو کر غیر جانبداری سے تحریر اور تقریر میں فلسطین کے حق میں احتجاج بھی کیا اور بدلے میں ابراہام ایلدن نے اپنی جان بھی دی۔ مصنفہ نے محمود درویش کے کردار کا بھی عمدگی سے تجزیہ کیا جس نے ایمان جیسی عجلت پسند لڑکی کو فدائی بننے سے روکا اور قلم کے جہاد کا مشورہ دیا کیونکہ فدائی بننے کی صورت میں دس بیس اسرائیلیوں کو ہلاک کرنے کے بعد مصیبت مظلوم اور بے بس فلسطینیوں پر ٹوٹتی تھی جن کو گھروں سمیت اسرائیلی فوجی راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔

ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ ظلم کے خلاف جب احتجاج ہوتا ہے یا مظلوم کی طرف سے مزاحمت ہوتی ہے تو بے جان چیزیں جو انسان کی فلاح کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ تختہ مشق بنتی ہے۔ یہ اقتباس بھی یہی کہانی سنا رہا ہے:

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

"کنگ ڈیوڈ ہوٹل کے اُس حصے میں آگ لگادی گئی ہے جو برٹش آرمی ہیڈ کواٹرز کے زیر استعمال تھا۔ بہت جانی نقصان کی اطلاع ہے۔ موسیٰ اس وقت آگستاو کٹوریہ اسپتال کی ایمر جنسی میں ہے۔ مجھے نہیں اُمید کہ وہ رات کو بھی آسکے گا۔

سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی تھیں۔ دیر بعد سارہ نے پوچھا تھا۔ کس کی کارستانی ہے یہ۔ شیخ قاسم کے گوریلے یاارگن (Irgun) سٹرن جتھے۔ یہی بدبخت ارگن جتھے ہیں۔ برطانیہ نے جو انکار کر دیا تھا۔ اب ان کے سپاہیوں کی لاشیں بھیج کر انہیں پیغام نہیں دینا کیا۔"[۳]

تاریخی شعور سے رچی اس کہانی میں سلمیٰ اعوان نے مزاحمت کے اس پہلو کو آشکار کیا ہے کہ نسلی برتری کے تفاخر میں رچے بسے یہودیوں نے دوسری اقوام کو حقیر سمجھ کر ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا، چنانچہ جب وہ مزاحمت پر اُترے تو انھوں نے ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا اور کہا کہ ہمیں اپنی نسل پر بڑا تکبر ہے اور دوسری قوموں کو حقیر سمجھتے ہیں۔[۴]

بیت المقدس جو دنیا میں بسنے والے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بیت المقدس کے حصول کے لیے کئی جنگیں لڑی گئی۔ مصنفہ نے بھی ناول میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان یروشلم کے حصول کی خاطر لڑی جانے والی جنگوں کا احوال اختصار سے لیکن جامعیت سے بیان کیا ہے:

"اب طاقت اور غلبے کا کھیل ایک نئی اور پرانی قوم میں شروع ہوا۔ عیسائی اور مسلمان آمنے سامنے صف آراء ہوئے اور یہودی ملکوں ملکوں تتر بتر۔ صدیوں بعد رومی اُٹھے۔ مسلمانون کو تہ تیغ کیا۔ مسجدیں جلادی گئیں۔

پھر فاطمی آئے۔ سلجوقی آئے۔ عیسائی متحد ہوئے اور طبل جنگ اس زور سے بجا کہ فاتح کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں تک مسلمانوں کے خون کے بہتے پانیوں میں چلے۔ پرڈینا نے جھرجھری لی۔

"مائی گاڈ" وہ چیخی

عباسی، سلجوقی، فاطمی، سب اپنی اپنی چھوٹی موٹی کچھاروں میں گم ہو گئے۔

پھر ایک جیالا سورج کی طرح طلوع ہوا۔ صلاح الدین ایوبی سو سال بعد اُس نے یروشلم پر قبضہ کیا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کو صلیبی جنگوں کا نام دیا گیا۔ مسلمان فاتح اور عیسائی مفتوح"[۵]

نفرت کو ہوا دینے میں چند جرم زدہ اذہان کے مالک نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ خوف وہراس کی فضا میں جابر حکمرانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکنے والے تاجروں اور عام لوگوں کی املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں، جس کے نتیجے میں جابر حکمرانوں کے ظلم کا نشانہ عام لوگ بنتے ہیں۔ مزاحمت کا یہ پہلو جس میں املاک اور غریب لوگ نشانہ بنیں کسی طرح بھی لائق تحسین نہیں علاوہ ازیں سلمٰی اعوان نے معاصر صورت حال کی منظر کشی بھی کی ہے:

"سائیکلوں پر تیزی سے پیڈل مارتے چند عربی باتیں کر رہے تھے اور منصور نے جانا تھا کہ عربوں کے ایک ہجوم نے بن یہود اسٹریٹ پر یہودی کمرشل سینٹر کو لُوٹ لیا تھا جس کے نتیجے میں فوراً یہودی ارگن دہشت گرد جتھوں نے شمال میں فلسطینیوں کی مضافاتی آبادی شیخ جراح اور مغرب میں قتامن کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔"[۶]

عاقبت نااندیش سیاست دانوں کی محدود سوچ عموماً بغاوت اور انقلاب کا راستہ کھولتی ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں غیر قوموں کو دراندازی کا موقع ملتا ہے سلمٰی اعوان نے یوسف ضیا کی زبانی فلسطین کے ارضی حالات کی لفظی عکاسی کی ہے یہی تیسری دنیا کے ممالک کا المیہ ہے۔[۷]

جنگ یا حالات خراب ہونے کے باعث مزاحمت کے دنوں میں خوف اور دہشت کی فضا کا سامناسب سے زیادہ عام آدمی کو کرنا پڑتا ہے، جس کا اس سارے المیے میں کوئی منفی کردار نہیں ہوتا۔ اس اقتباس میں بچوں کی مثال دی گی ہے، جو بچے ہونے کے باوجود خطرے کو محسوس کرتے ہیں۔ گردونواح کی سڑک پر قیامت کا منظر ہے جہاں کچھ دیر قبل زندگی مسکرا رہی تھی:

"وہ چونکہ بچے تھے گو خطرے کو محسوس تو کرتے تھے پر شاید اس کی شدت سے آگاہ نہ تھے۔ بگٹٹ سائیکل چلاتے بھاگے چلے جارہے تھے۔ لوگ دائیں بائیں دیکھے بغیر دوڑیں لگا رہے تھے۔ سڑک پر قیامت کا سا منظر تھا۔ وہی جگہ جہاں چند لمحے پہلے زندگی ہنس رہی تھی اب جان بچانے میں گھائل ہو رہی تھی۔"[۸]

سلمٰی اعوان کا اسلوبِ بیان سادہ اور عام فہم ہے۔وہ قاری کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں نہیں الجھاتی بلکہ کہانی کو سیدھے سبھاؤ بیان کرتی ہیں۔اس اقتباس میں بھی انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں فلسطینی مسلمانوں کی نسل کشی کی تصویر کشی کی ہے۔اقتباس ملاظہ کیجیے:

"حالات کا چہرہ کیا تم سے چُھپا ہوا ہے۔کیسے ایک قوم دوسری کا تخم مارنے اور اسے دیس نکالا دینے پر تلی ہوئی ہے۔زمانوں سے اس معاشرے میں رہنے والوں کے درمیان سے محبت اور اعتماد کی خوشبو اُڑ گئی ہے۔انسانیت کا فقدان ہو گیا ہے۔مذہبی تعصب اور نسلی تفاخر اپنی انتہا پر پہنچ گئے ہیں۔"[۹]

مصنفہ نے فلسطین میں انسانی درندگی اور ارضی حالات کا احوال جہاں سادہ اور عام فہم نثر میں کہانی کے عنصر میں بیان کیا وہیں انہوں نے تاریخی تناظر میں معروف عربی شعرا کے اشعار کے ذریعے بھی فلسطین کی سرزمین پر ہونے والی درندگی کے مزاحمتی پہلو کو کرب انگیز انداز میں بیان کیا ہے، جس میں شعرا نے اپنے کلام میں فلسطین جیسے مقدس خطے کے پھولوں کو روندتے ہوئے دکھایا ہے۔علاوہ ازیں نظمیہ انداز میں اس امر کا اظہار بھی کیا کہ تخلیق کار کا تعلق کسی بھی زبان کے ادب سے ہو، وہ اس مقدس خطے پر ہونے والے وحشیانہ تشدد کے خلاف قلم کی طاقت سے احتجاج کرتے رہیں گے۔نظم کا یہ اقتباس بین الاقوامی شعرا کے اس خیال کا غماض ہے:

"میں زمین کے اُس ٹکڑے پر اُس کا نام ضرور لکھوں گا۔
جس پر قبضہ کر لیا گیا
میرے گاؤں کا نقشہ جہاں پھیلا ہوا تھا
کیسا کیسا گھر اُجڑ گیا
کیسا کیسا درخت لُٹ گیا
کتنے خوبصورت جنگلی پھول پامال ہو گئے
مجھے اُنہیں یاد رکھنا ہے اور میں یہ سب لکھتا رہوں گا
اپنے دُکھوں کے ہر باب کے سانحہ کے ہر مرحلے کو
چھوٹی بڑی سب چیزوں کے ناموں کو
اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے زیتون کے درخت کو"[۱۰]

فلسطین میں صرف یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہی نفرت کا معاملہ نہیں ہے عیسائی اور یہودی بھی ایک دوسرے سے اسی طرح نفرت کرتے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف طاقت کا وحشیانہ استعمال اور معصوم، بے ضرر بے گناہ لوگوں کو ذلت آمیز موت کی سزا دینا اور پھر اس وحشیانہ عمل پر خوشی کا اظہار کرنا ان تمام عوامل کو مصنفہ نے عمدگی سے عکس بند کیا ہے۔ جن کے ذمے انصاف اور عدل کا کام ہوتا ہے وہ لوگ بھی جب تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور گناہ گار کو سزا دینے کے بجائے اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہوئے فیصلہ گناہ گار کے ہی حق میں کرتے ہیں تو مظلوم طبقہ اسی طرح مشتعل ہو کر گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہوں کی موت اور املاک کی تباہی کا سبب بنتا ہے، جس طرح قاضی کا یہودیوں کے حق میں فیصلہ دینے کے بعد عیسائیوں نے ظلم کیا:

> "ابھی سوچ وبچار کی انہی چکروں میں تھی کہ ایک شام تینوں لڑکے اشکنزئی کالونی کے عقب میں واقع گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلنے گئے۔ مخالف ٹیم عیسائی لڑکوں کی تھی۔ چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ سر پھٹول ہوئی۔ معاملہ سٹی بلدیہ کے قاضی کے سامنے پیش ہوا جس نے فیصلہ یہودی لڑکوں کے حق میں دیا۔ مگر عیسائیوں کے مشتعل ٹولوں نے رات کو یہودی کوارٹروں میں آگ لگا دی۔ ایسی خوفناک آگ تھی کہ جس نے بیٹوں، شوہر سبھوں کو نگل لیا۔ وہ بھی مہینوں اسپتال میں زیرِ علاج رہی۔"[11]

دہشت اور بربریت کی اس فضا میں جہاں یہودیوں اور عیسائیوں کا کردار مخص ظالم اور دہشت پسند کے طور پر سامنے آیا وہیں "یائل" اور "منڈل" جیسے مسیحا کے کردار بھی نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے کیمپوں میں مسلمان مریضوں کے لیے خود کو وقف کر دیا اور یہ ثابت کیا کہ مذہب بُرا نہیں ہوتا بلکہ لوگ متعصب ہوتے ہیں اور وہ کسی بھی مذہب کے ہو سکتے ہیں۔ جیسے عرب ریاستوں کے مسلمان حکمران جو امریکہ اور اسرائیل کے کٹھ پتلی غلام بن کر مسلمان بہن بھائیوں کے قتل اور عصمت دری کا بہیمانہ کھیل دیکھتے رہتے ہیں لیکن عمل سے گریز کرتے ہیں:

> "انہوں نے دمشق کے اسپتالوں کے متعلق بتایا جہاں نیپام بموں سے جھلسے ہوئے لوگ تھے۔ معصوم بچے تھے۔ قنطیرہ کے کسانوں کی کہانیاں تھیں۔ شام اور اسرائیلی مشترکہ سرحد کے شامی گاؤں اسرائیلی فوجیوں کی اشتعال انگیزیوں کے گواہ تھے۔ فیکے گاؤں پر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اسرائیلی وزیر خارجہ موشے دایان نے جس طرح اس کی تباہی

وبربادی کروائی ارینا روتھ کو اس پر شدید غصہ تھا۔ ارینا روتھ موشے دایان کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔"[۱۲]

سلمٰی اعوان نے ناول میں مزاحمت کے ایک اور رخ سے متعارف کروایا ہے۔ ناول کا کردار "ابراہام ایلان" یہودی ہے لیکن سچا اور کھرا ہے۔ اسرائیلیوں نے فلسطینیوں کی نسل کشی کے لیے جس طرح کیمیکل کا استعمال کر کے زمینوں کو بنجر کرنے کے ساتھ ساتھ زیرِ زمین پانی کو آلودہ کیا اس کے متعلق ابراہام ایلان نے اخبار میں مضامین لکھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اس کی زندگی کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا ہے اس کے باوجود اسرائیلی کارروائیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کو ناول نگار نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "یائل نے پڑھنا شروع کیا مغربی کنارے کی پہاڑیوں پر بنی Settlements نیچے وادیوں میں رہنے والے فلسطینیوں اور کیمپوں کے لیے اذیت کا باعث بن رہی ہیں۔ ناہالن (Nahhalin)، قتانا (Qatanna)، دُرا، ال جانیا ایسی اور بے شمار نئی آبادیوں کی تمام تر گندگی اور غلاظت وادیوں میں آ رہی تھی اور ایسا جان بوجھ کر کیا جا رہا تھا۔ بہت سے صنعتی یونٹوں کے بارے میں رپورٹ تھی کہ جنہیں اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں میں شفٹ کیا اور مزید کو کیا جا رہا تھا۔ ان صنعتوں کا فضلہ سڑس پھلوں کے باغات کو سخت نقصان پہنچا رہا تھا۔ کاشت والی زمین خراب ہو رہی تھی اور زیرِ زمین پانی زہر آلود ہو رہا تھا اور یہ سب انتہائی سفاکانہ اور ذلیلانہ فعل ہے۔ "اُسے ایسے ہی لکھنا چاہئیے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ فلسطینیوں کے بچے بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ کمینی اور انسانیت سوز حرکات ہیں"[۱۳]

ناول نگار نے محمود درویش کے کردار کی کرافٹ عمدگی سے کی ہے، جس نے انفرادی مزاحمت کی راہ پر چلنے والی ایمان کو فدائی بننے سے روکا اور نصیحت کی کہ تم ان پانچ عربوں کی طرح بننا چاہتی ہو جنھوں نے اندر گھس کر گیارہ اسرائیلی کھلاڑیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اگر تم فدائی بنو گی تو اس کے نتیجے میں اسرائیلی فوج میزائلوں اور کرافٹوں کے ساتھ شدت سے نہتے فلسطینیوں پر حملہ کریں گے تو ایمان بیٹا بندوق کے بجائے قلم کی مدد سے اسرائیلی جارحیت کے خلاف مزاحمتی انداز اپناؤ۔[۱۴]

سرزمینِ فلسطین پر مزاحمت کے بعد عفو و درگزر کی صرف دو مثالیں ملتی ہیں ایک حضرت عمر کے دور میں جب یروشلم فتح ہوا تو حضرت عمر نے عیسائی عبادت گاہوں تک کا احترام کیا اور خون ریزی نہ ہونے دی۔ دوسری

روایت صلاح الدین ایوبیؒ کی تھی۔ جنھوں نے یروشلم فتح کیا تو تمام لوگوں کو ان کی مذہبی آزادی دی گئی، یہاں تک کہ یہودیوں نے بھی انہیں نجات دہندہ سمجھا۔ اس کے برعکس جب بھی یہودیوں یا عیسائیوں نے یروشلم پر یلغار کی اور فاتح ہوئے تو سرزمینِ فلسطین مسلمانوں کے خون سے سرخ ہوئی۔ ارضِ فلسطین پر ہر دفعہ مسلمانوں کو جنگ کے عذاب میں دھکیلا گیا اور ہر بار مسلمانوں کو دفاع کرنا پڑا اور وہ مجبوراً مزاحمت پر آمادہ ہوئے کہ زندگی کی ضمانت مزاحمت کی مرہون منت تھی۔ سلمٰی اعوان نے پورے ناول میں یہودیوں اور عیسائیوں کے خون آشام چہروں سے پردہ دلیری سے اٹھایا ہے کہ آج کے مادیت پرست معاشرے کا قاری کا بھی پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔

"حبس" (۲۰۱۶ء) حسن منظر کے قلم کا نتیجہ ہے، جو اسرائیل کے گیارہویں وزیر اعظم "ایریئل شیرون" کی زندگی کے ان آٹھ برسوں پر محیط ہے، جب وہ ستر برس کی عمر میں دماغی فالج کا شکار ہو کر بے حس و حرکت بستر مرگ ہو جاتا ہے۔ ناول میں خود کلامی کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ جس میں مختلف کرداروں کے ذریعے ایریئل شیرون کے سیاہ کارناموں اور انسانیت سے گری ہوئی ذلیل ترین حرکتوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ ناول کے آغاز میں ایریل شیرون کا دوست "ایرک" بستر مرگ پر ماضی میں ڈھائے جانے والے مظالم کے متعلق کہتا ہے کہ یروشلم کی زمین تجھے پہچانتی نہیں کیونکہ تم نے ان نہتے فلسطینیوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے تھے۔ آپ کو بھی امریکہ کی طرح ایک دن خالی ہاتھ واپس لوٹ کر جانا پڑے گا کیونکہ فلسطینی باشندوں نے تاریخ کی سب سے طویل اور شدید جارحیت کے بعد بھی یہاں سے ہجرت نہیں کی۔ اس اقتباس میں ایرک کے مکالموں کے ذریعے ایرائیل شیرون کی فوج کا ارضِ فلسطین پر ڈھائے گئے مظالم کا غماض ہے:

> "عمارتوں پر بوم کی اور کھیتوں باغوں میں شیلنگ کی۔ تاکہ کسی گھر کے شیشے سلامت نہ رہیں اور زمین کی پیداوار زمین میں سما جائے اور جہنوں نے ہزاروں سال سیوا کی ہے بھوک اور پیاس سے گھبرا کر یہاں سے نکل جائیں۔۔۔۔۔ لیکن جس طرح امریکی ویت نام ایک دن خاموشی سے خالی کر گئے جاتے جاتے فلسطین کی چھاتی پر تم بھی یور نئیم ڈسٹ چھڑکتے جانا"[۱۵]

ناول میں دوسری تکنیک آپ بیتی کی استعمال کی گئی ہے اس تکنیک کے ذریعے اسرائیلی وزیر اعظم کے بیتے لمحوں کو آشکار کیا گیا ہے ناول میں ریاستی جبر اور اسرائیل کے نہتے فلسطنیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا تذکرہ ہے۔ مزاحمتی انداز سے دیکھا جائے تو ناول میں سب سے بڑا مزاحمتی پہلو فطرت کی مزاحمت ہے، جس نے

آٹھ سال تک ایریل شیرون کو آٹھ برس تک معذور رکھا اس کے کیے تمام مظالم کی اسے جی بھر کر سزا دی ہے۔ مزاحمت کا یہ رخ نہ صرف یہ کہ نیا ہے بلکہ اچھوتا بھی ہے۔ناول نگار نے اس مزاحمتی رخ کو مکالموں، خود کلامی اور آپ بیتی کی تکنیک کے ذریعے دیانت داری سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

"فطرت کی تعزیریں سخت ہوتی ہیں" حسن منظر نے اس جملے کی تشریح تمام ہولناکیوں کے ساتھ بیان کی ہے۔ مزاحمت کے اس نرالے اور انوکھے رنگ کو جو ایریل شیرون کی موت کی راہ میں مزاحم ہے۔ حسن منظر نے عمدگی سے پینٹ کیا ہے ساری زندگی دوسروں کو ظلم کی چکی میں پیسنے والا اتنا مجبور اور معذور ہے کہ ان مناظر کو جن کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ مرضی کے خلاف دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ اقتباس اس مزاحمت کا غماض ہے:

> "تم نے بہت سوچ سمجھ کر زائیونسٹ ملٹری کے بساط کے لیے یہ نقشہ تیار کیا تھا۔ اب مہرے تمہاری مرضی کے مطابق چلے جارہے ہیں۔ تم مرحوم بشیر گمائل کے گھرانے والوں سے ملے تھے کہ "فسطینی اُس کے قتل کے پیچھے ہیں اور بدلہ لینا ضروری ہے۔ ہم نے انہیں ازرے ائیل کی زمین پر نہیں رہنے دیا تم انہیں لبنان سے نکالو۔" اور لبنانی فلسطینیوں سے اس قتل کا بدلہ لے رہے ہیں، جو انہوں نے نہیں کیا تھا۔ ایک دن بیتا، ایک رات بیتی، ایک اور دن بیتا۔۔۔ چوبیس + چودہ گھنٹے ۔ مجھے میری مرضی کے خلاف کیلنڈر کے وہ اوراق دکھائے جارہے ہیں۔۔۔۔ ستمبر ۱۸، ۱۷، ۱۶۔ کاش میں اپنی آنکھوں کو پھوڑ سکتا۔'
> 'آنکھیں کہاں تمہارا دماغ دیکھ رہا ہے بیسویں صدی کے تموجن"[۱۶]

ناول میں جہاں ایریل شیرون کی زندگی کے آٹھ مفلوج برسوں کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں مختلف کرداروں کے مکالموں اور خود کلامی کی تکنیک کے ذریعے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے اسرائیلی فوج اور شیرون کے مظالم کا پردہ بھی چاک کیا گیا ہے۔

حسن منظر کا پورا ناول اس مزاحمتی رویے کا عکس ہے جس میں ایریل شیرون اپنی مفلوج زدہ آٹھ برس کی زندگی میں دوچار ہوا سے وہ کچھ دکھایا گیا، جو وہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ نہ دیکھنے کے لیے شدید ترین ذہنی مزاحمتی کی جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ اس نے کیا لیکن بے سود ہو کر رہی اس کی ساری مزاحمت بے کار گئی:

> "مگر یہاں بار بار آوازیں آپس میں میری زندگی کے واقعات کو دہراتی تہراتی رہتی ہیں اور یہی کام دیوار پر موویز دکھا کر کیا جاتا ہے۔ اور اس ایذا دہی میں وقت کی کوئی ترتیب نہیں

ہوتی۔ ۱۹۸۲ء پہلے آسکتا ہے۔ ۱۹۷۶ء بعد میں۔ دیریٰس کے ساتھ ساتھ الزتّار کا قتل عام، بچپن جوانی سب گڈ مڈ۔ اوران سب اذیتوں سے بڑھ کر ایک ایک واقعے کا بار بار دکھائے جانا ہے۔ ان کے پسندیدہ سین ہیں صابرہ شتیلہ، قیبیہ، رامیہ س، دیریٰس، یاسر عرفات کے گھر پر ٹینکوں سے چڑھ دوڑنا۔ بعض وہ قتل عام ہیں جن میں میں موجود بھی نہیں تھا۔۔۔ مقصد وہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ تم سب دہشت گرد ہو، امن پسند لوگ نہیں۔"[۱۷]

حسن منظر نے علامتوں اور استعاروں کو عمدگی سے برتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں تلمیح کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ ایریل شیرون کی موت کی راہ میں حائل فطرت نے اس کو جس طرح بے دست پا کیا وہ الم ناک ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز بھی ہے کہ ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے لیکن وہ اپنے انجام سے نہیں بچ سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افتخار شفیع، محمد، اُردو ادب اور آزادیِ فلسطین، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۱ء، ص:۳۸

۲- مستنصر حسین تارڑ، راکھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص:۲۳۲

۳ - سلمیٰ اعوان، لہو رنگ فلسطین، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص:۶۵

۴ - ایضاً، ص:۸۰

۵- ایضاً، ص:۸۱

۶ - ایضاً، ص:۸۹

۷ - ایضاً، ص:۹۲

۸ - ایضاً، ص:۹۰

۹ - ایضاً، ص:۹۵

۱۰ - ایضاً، ص:۱۱۱

۱۱ - ایضاً، ص:۱۲۶

۱۲ - ایضاً، ص:۲۰۲،۲۰۱

۱۳ - ایضاً، ص:۲۴۱

۱۴ - ایضاً، ص:۲۹۰

۱۵ - حسن منظر، حَبس، کراچی، شہر زاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص:۲۳،۲۲

۱۶۔ ایضاً، ص:۲۷،۲۶

۱۷۔ ایضاً، ص:۲۸۲